[illegible]

نام و ننگ

عبدالمجید بھٹی

نام و ننگ

سنگم پبلشرز لمیٹڈ • لاہور

ہر کسی کے نام

تعارف

(حفیظ جالندھری)

مجید بھٹی کی شاعری بزمِ احباب، مشاعرے، ریڈیو، رسائل
تمام مراحل تھوڑی سی مدت میں طے کر گئی - اور اب اس مقام
پر ہے جہاں ہر نو وارد صاحبِ تخلیق کو شک و شبہ سے دیکھا جاتا
ہے - جہاں شاعری ہی نہیں، شاعر کو بھی ماپنے کے لئے رنگ
رنگ کے پیمانے ہیں - اور جہاں ایسے آلات موجود ہیں جو شعر کے
میکانکی اور نفسیاتی ریشوں کو الگ الگ کر کے شاعر کا مزاج دریافت
کر سکتے ہیں - جہاں تحقیق کا آنکڑا دل کی گہرائیوں تک اُتار دیا جاتا ہے -
یہ وہ منزل ہے، جہاں اندیشہ ہوتا ہے کہ شاعر کو مستقل حیثیت
حاصل ہو رہی ہے - اور اگر بدقسمتی سے شاعر زندہ ہو، اپنے ہمعصروں میں
موجود ہو تو کوشش کی جاتی ہے کہ اس کو دنیائے ادب میں مستقل حیثیت

حاصل کرنے سے پہلے موت کے گھاٹ اتار کر دیکھ لیا جائے کیونکہ ممتحن لوگوں کے نزدیک شاعر وہ ہے جو ہلاک ہونے کے بعد بھی زندہ رہے۔

مجید بھٹی کو اب بھی منزل درپیش ہے۔ ان کے گیتوں اور نظموں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ شائع ہو رہا ہے

ہمارے ملک میں شاعر جب تک بزم احباب، مشاعروں، ریڈیو، رسائل تک محدود رہتا ہے۔ لوگ سنتے ہیں، پڑھتے ہیں اور کچھ کہتے بھی ہیں لیکن واقعی اہمیت نہیں دیتے۔ واقعی اہمیت اس وقت دیتے ہیں جب اس کی شاعری ایک مجموعے یا کتاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بہت غور و خوض اور چھان بنان کے بعد ہمارے ناقدوں نے یہ بات دریافت کر لی ہے کہ کتاب، صاحب کتاب کو اس کی جسمانی موت کے بعد بھی نہ صرف زندہ رکھتی ہے۔ بلکہ اس کے خیالات، تاثرات اور تجربات آئندہ نسلوں کو متاثر کرنے کی بے پناہ طاقت بھی بن جاتے ہیں۔ چونکہ طاقت مفید بھی ہو سکتی ہے اور مہلک بھی اس لئے یہ پرکھ، یہ امتحان، یہ میکانکی اور نفسیاتی جراحت واجبی سمجھی گئی ہے۔

مجید صاحب بھٹی کی کتاب "نام ونگ" شائع ہو جائیگی۔ پرانے اور نئے، چھوٹے اور موٹے ناقد، ہر خیال کے لوگ اس پر بہت کچھ کہیں گے۔ اور جناب مجید کو دا گر وہ مجموعہ شائع کرنے کے بعد زندہ رہے) سننا ہوگا۔ اس گھاٹی میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ البتہ اپنے تجربے کی بنا پر میں مجید صاحب کو ہمعصر شعرا

ناقدین کرام کے فنِ جراحت سے حظّ اُٹھانے اور ہو سکے تو مُسکرا کر داد دینے کا مشورہ دے سکتا ہُوں۔ کیونکہ مجید صاحب کی شاعری میں زندگی اور زندہ رہنے کی پُوری قوّت نظر آتی ہے۔

مَیں اس مجمُوعہ کے آغاز میں چند سطور بطور تعارف لکھ رہا ہُوں۔ اس لئے نہیں کہ مَیں مجید کی شاعری کا سب سے بڑا مدّاح ہوں۔ نہ اس لئے کہ رگ و ریشہ کو الگ الگ کر کے ان کے کلام کی میکانکی یا نفسیاتی تشریح کر ڈالنے کا اہل ہوں۔ بلکہ محض اس لئے کہ مَیں ہی ایک عینی شاہد اور بڑی حد تک سبب اس حادثہ کا ہوں جس نے مجید بھٹی کو بھلے چنگے آدمی سے شاعر بنا کر رکھ دیا۔ آپ نے دیکھا نہیں تو سُنا ہو گا کہ جب زلزلہ آتا ہے تو بعض جگہ سنگلاخ چٹانوں کے جگر سے صاف شفّاف پانی کے فوّارے پھُوٹ نکلتے ہیں۔ بے آب و گیاہ زمین شاداب ہونے لگتی ہے۔ بعض جگہ پتّھر پھٹ جاتے ہیں۔ دھُواں اُٹھتا ہے۔ آگ کے شعلے لپکتے ہیں۔ لاوے بہہ نکلتے ہیں۔ زمین کی روئیدگیاں جل جاتی ہیں۔

میرے لئے یہ ضروری نہیں کہ مَیں اس تعارف کے سلسلے میں ارضی زلزلہ کے وجُوہ بیان کروں۔ یہ کام ماہر طبقات الارض کا ہے۔ لیکن میں گواہ ہوں کہ مجید بھٹی صاحب پینتیس برس کی عمر تک شعر و شاعری کے معاملہ میں سنگلاخ

چٹان تھے یا بیابان۔ دُوسرے کو تو کیا۔ خود اُن کو بھی یہ گمان نہ تھا کہ ان پہ ایک دن یہ مصیبت ٹُوٹنے والی ہے۔ اور نہ اُن کی تمنّا تھی کہ اپنا سینہ شق ہونے کے درد و کرب میں مبتلا ہُوں اور قلب کے اندر سے خون اور آگ کے فوّارے نکلنے کی بہار دیکھیں۔

کون یقین کرے گا کہ ایک شخص جس کے خاندان میں، گاؤں محلے میں نہ کوئی شاعر ہو نہ شعر و نغمہ کا ماحول۔ جو پنجاب کے دیہاتی سکول میں تعلیم پائے۔ پرائمری سکول کی مدرسی سے زندگی شروع کرے۔ اپنے ضمیر کو مدرسی کے ماحول میں مطمئن نہ پا کر کتابت یعنی خوشنویسی شروع کر دے۔ ایک مدّت کتابت کرتا رہے۔ کتابت کو نقل راچہ عقل گردانے۔ اور کاتبوں کی ذہنی اور سماجی حالت سے بیزار ہو کر اپنے لئے اس پیشے میں بھی گنجائش نہ دیکھے۔ اور دوسروں کی دیکھا دیکھی بچّوں کا ایک تعلیمی رسالہ یا اخبار نکالنے کا ارادہ کرے۔ اور ایک ایسے شاعر سے جو کتابت کے سلسلے میں اس کا گاہک تھا یہ توقع کرے کہ مستقل طور پر اس ہفتہ وار اخبار کے لئے نظمیں لکھا کریگا۔ اور ان نظموں پر اپنے رسالے کی کامیابی کا بڑی حد تک انحصار سمجھے۔

کتابت کا گاہک، دوست شاعر معذوری ظاہر کر دے اور کہہ دے کہ دو چار نظمیں تو بحقِ دوستی ممکن ہیں۔ لیکن ہر ہفتہ استقلال کے ساتھ بغیر کسی معاوضہ کے یہ خدمت (باوجود احساسِ دوستی) محال ہے اس لئے

کہ دوست شاعر کا ذریعہ معاش صرف قلم ہے۔
یہ ہے زلزلے کی گونج، توقع مجروح ہوتی ہے۔ آنکھیں کھل جاتی ہیں پہلی مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر لوگ بھی اپنی زندگی قائم رکھنے کے لئے روٹی پیدا کرنے پر مجبور ہیں۔ اور صرف اخبار یا رسالہ میں نظم شائع ہو جانے کی خوشی ہی سے ان کا پیٹ نہیں بھر جاتا۔
یہ بھونچال۔ یہ سخت ترین حادثہ مجید صاحب کو پیش آیا۔ میں ہوں وہ کتابت کا گاہک، وہ دوست شاعر جس نے مستقل طور پر ہر ہفتہ مفت لکھنے سے انکار کیا۔ اور میں ہوں وہ شخص جس نے چند دنوں کے بعد دیکھا کہ رسالہ نکلا۔ اور اُس میں اسی طرز اور رنگ کی نظمیں شائع ہونے لگیں جس طرز اور رنگ کی توقع مجھ سے کی گئی تھی۔ ان نظموں کے لکھنے والے مجید بھٹی صاحب تھے۔
میرے انکار نے، اور میرے انکار کے بعد چند دوسرے صاحبان سے معاملہ کرنے میں ناکام رہنے کی وجہ سے مجید کا سینہ شق ہو گیا اور وہ سب کچھ آبِ شیریں کے فواروں اور آگ اور گندھک کے شعلوں کی طرح پھوٹ نکلا جس کو عرفِ عام میں شعر شاعری اور گیت نظم وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے۔ جہاں کسی کو بھی پچیس برس تک شعر و شاعری اور نغمے کا نشان نظر نہ آتا تھا۔ وہاں ایک دریا بہتا دکھائی دینے لگا۔

ان الفاظ کے ساتھ میں مجید صاحب کو دنیائے شعر سے متعارف کرتا ہوں اور اپنے علم اور یقین کی بنا پر کہتا ہوں کہ مجید ہماری دنیائے ادب میں ایک نیا شاعر ہے ۔ نئی گھڑنت کا شاعر ہے ۔ ہر حالت میں نیا ۔ خیالات، اسلوب، بیان، احساسات، قوتِ اظہار، ذریعۂ اظہار ہر لحاظ سے نیا۔

گانا نہیں جانتا ۔ گیت لکھتا ہے ۔ عروض نہیں پڑھا ، کلام موزوں ہے ۔ کتابوں سے زندگی کی کہانیاں مطالعہ نہیں کیں ۔ خود زندوں کی دنیا میں ہے ۔ جو دوسروں پر بیت رہی ہے ۔ جو اپنی ذات پر گزر رہی ہے ۔ دیکھتا ہے ، محسوس کرتا ہے ۔ کہتا ہے ۔ اور اس طرز سے کہتا ہے کہ سننے والے بھی اسی طرح دیکھنے اور محسوس کرنے لگتے ہیں ۔

مجھے اپنے دورِ حیات میں ہر طبقہ کے شعرا سے ملنے جلنے اور ان کے فن اور اسلوبِ فکر سے آشنا ہونے کا موقع ملا ہے ۔ مجید کو چھوڑ کر میں نے دو طرز کے شاعر دیکھے ہیں ۔ اول وہ جن کو رسمیاتی یا روایاتی کہنا چاہیئے ۔ کیونکہ ان کو پرانی رسوم و روایات کے ساتھ دل بستگی ہے ۔ دوسرے وہ جن کو ترقی پسند شعرا کا نام دیا جاتا ہے ۔

ان دونوں کے متعلق میں نے اپنے زمانہ کے ناقدین کی آرا بھی سنی اور پڑھی ہیں ۔ ان کی آرا کا نچوڑ یہ ہے :-

وہ شعرا جو روایات کو چھوڑنا نہیں چاہتے ان میں کامیاب وہ

ہیں جو اپنے فن کے لئے مطالعہ مشق اور انتہائی فکر سے کام لیتے ہیں - زبان اور اسلوب کے معاملہ میں محتاط ہیں - اس لئے جو کچھ وہ کہتے ہیں بلند ہو یا پست - با معنی اور سلجھا ہوا ہوتا ہے - دوسرے کی سمجھ میں بھی آتا ہے - لیکن بقولِ ناقدین وہ اپنے خیالات کی رُو سے اپنی ولادت بلکہ اپنے اساتذہ کی ولادت سے بھی پہلے زمانہ کے ہیں - کیونکہ ان کا سارا مطالعہ متقدمین کے دواوین اور کسی بہت ہی پرانے زمانہ میں بنے یا بنائے ہوئے فن عروض تک محدود ہے - وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہیں - بے خبر رہنا چاہتے ہیں - اپنی زندگی وہاں گذارتے ہیں جہاں ہنگامۂ حیات کا کوئی اثر ان تک نہ پہنچے - انفرادی یا اجتماعی - زندگی کے مسائل مشرق میں پیدا ہوں یا مغرب سے آتے ہوں ان تک نہیں پہنچتے اور وہ خود بھی ان تک پہنچنا نہیں چاہتے - اگر کبھی کبھار اس قیامت خیز طوفان کی جھلک نظر آتی بھی ہے تو اس طرح آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں - جیسے خدانخواستہ وہ خود کسی شرمناک جرم کے مرتکب ہوئے ہیں - لہٰذا ان کی شاعری غزل ہو یا نظم - صنائع بدائع کی نمائش اور الفاظ کے الٹ پھیر کا بے جان مرقع بن کے رہ جاتی ہے -

ناقدین کی رائے میں ترقی پسند کہلانے والوں میں بھی اکثر ایسے

ہیں جن کو ماحول نے مشق اور فکر کی وہ فرصت اور فراغت نہیں
دی جو شعر کے لئے لابدی ہے۔ ان کا مطالعہ مغربی ادب اور
ایک دو ناقدین ادب کی چند کتب تک محدود ہے۔ ان کے اندر
شاعری موجود ہے لیکن وہ ذریعہ جس سے اس کا اظہار ہو چونکہ
بہت دقت طلب ہے اس لئے وہ "شارٹ کٹ" سے
پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ جانے کی تگ ودو میں ہیں۔ سمجھتے ہیں
کہ شعر کی ہیئت ترکیبی کو بدل دینے سے وہ ان تمام ذمہ داریوں
سے بچ نکلیں گے جو شعر کو مؤثر اور قابل قبول بنانے اور آئندہ زندگی
میں زندہ رکھنے کے لئے ہر صاحب فن کو ملحوظ رہنی چاہئیں۔
جنہیں "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ" کہلانے والے ملحوظ رکھتے
رہے ہیں اور جن کے اشعار آج تک ہماری زبانوں پر ہیں +
نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہیئت ترکیبی، یا دوسرے لفظوں میں
تصویر کھینچنے کی بجائے محض چوکھٹے کے نئے زاویوں پر قائم کرنے
میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے آرٹ میں چوکھٹے ہی چوکھٹے نظر آتے
ہیں۔ تصویریں کم دکھائی دیتی ہیں۔ اگر دکھائی دیتی ہیں تو اس طرح
کہ سر، پیر، بازو، ناک، رخسار الگ الگ اور اکثر ایک دوسرے میں
گتھے ہوئے۔ اب یہ اہل نظر کا اپنا کام ہے کہ ان اعضاء کو اپنی اپنی

جگہ پر جوڑ کر کوئی تصور قائم کریں۔

اگر میں نے ناقدین کی رائے غلط نہیں سمجھی تو اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ رسمیاتیوں اور روایاتیوں میں روحِ شعر یعنی زندگی کے میدان میں اپنا ذاتی تجربہ موجود نہیں۔ اور نہ وہ اپنے اردگرد کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن بعض چیزیں ان کو حاصل ہیں۔ یعنی اپنے آباواجداد کی تہذیب سے ابھی تک ان کی اپنی وابستگی اور گزری ہوئی دنیا کے تجربہ کاروں کے احساسات کا مطالعہ جو شعروشاعری کی صورت میں موجود ہے۔ اس مطالعہ سے جو احساسات ان میں پیدا ہوتے ہیں ان کے اظہار کے لئے مشق تو اتر مشق نے حرف جوڑنے کی کاریگری ان کو مہیا کر دی ہے۔ وہ تصویریں بناتے ہیں۔ آپ کہتے رہیئے کہ یہ تصویریں پرانے زمانے کے لوگوں کی ہیں ترقی پسندوں میں سب کے سب بنفس نفیس طوفان میں ہیں۔ ہر تھپیڑا لہر ایک طمانچہ ہے۔ یقیناً ان کی فریاد ان کے اس تجربے کا مرقع ہونی چاہیئے لیکن افسوس، ابھی ان کو اپنے ذاتی شعور پر اعتماد نہیں۔ وہ ابھی دوسرے اور دُور دراز کے تجربہ کاروں کا منہ دیکھ رہے ہیں۔ انہیں کے زاویہ نگاہ کو اپنا زاویہ نگاہ سمجھ رہے ہیں۔ ساتھ ہی ایک کمی اور بھی ہے وہ یہ کہ ان کے پاس مشق اور فکر کے لئے فرصت نہیں ہے۔ حرف جوڑنے کی کاریگری بھی وہ سیکھنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ یہ محنت کی بات ہے۔

شاعر کی اپنی زندگی کا تجربہ اور اس تجربے سے پیدا ہونے والے احساسات کا اظہار ہی ترقی پسندی ہے۔ اور یہی وہ فرد ہے جو اجتماعیت کی زبان ہے۔ شعر کے لئے (یہ شرط نئی ہو یا پرانی) ارادہ ضروری ہے۔ اور ارادہ نصب العین رکھتا ہے۔ نصب العین تک پہنچنے کے لئے ذرائع درکار ہیں۔ اس لئے وہ جواں ہمت جو نصب العین تک پہنچنے کے لئے شعر کہتے ہیں۔ یقیناً ارادے سے کہتے ہیں۔ پھر کیوں نہیں وہ ذرائع اختیار کرتے جن سے شعر مؤثر ہو جائے۔ کیونکہ تاثر ہی شعر کا نصب العین ہے (وہ ذرائع ہیں سینہ کاوی اور انتہائی فکر ——————)

یہ ہے ناقدین کی رائے کا نچوڑ رسمیاتی اور ترقی پسندوں کے متعلق۔
اب مجید کے متعلق نہ جانے کیا کہا جائے گا۔

ایک بات تو یقینی ہے۔ کہ وہ روایاتی اور رسمی تو ہرگز نہیں۔ البتہ ترقی پسند اسے اپنے گروہ میں شامل کرتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ مغربی ادب اور زندگی کی کوئی جھلک مجید نے نہیں دیکھی۔ اور نہ ناقدینِ ادب مغرب کی رائے سے استفادہ کیا ہے۔ اس لئے کسی حالت میں بھی وہ اس گروہ میں شامل نہیں ہے۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں وہ ہماری دنیائے شعر میں نووارد ہے۔ ایک نیا شاعر ہے۔ اس نے متقدمین کے کلام کا مطالعہ نہیں کیا۔ اس نے قافیے

زانو تہہ

کرنا تو درکنار اُس نے کسی استاد کے سامنے
تصویر بنانے سے پہلے چوکھٹے نہیں بنائے۔
ہاں اُس نے پینتیس برس تک زندگی کی ہے۔ زندگی کرنا اور زندگی گزارنا دو مختلف باتیں ہیں۔ وہ ایسے ماحول میں ہے جہاں کشمکش حیات کا دھارا اپنے پورے زور پر ہے۔ مسائل جو زندگی خود پیدا کرتی ہے اس کے سامنے ہیں۔ وہ ان مسائل کا حل نہیں بتاتا۔ وہ کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔ وہ ہمہ تن سوال ہے۔ اور آج ہمہ تن سوال ہونا ہی شاعری ہے۔ اس کا انداز فکر ہم سب کے لئے روایاتی و رسمیاتی اور نئے ترقی پسند سب کے لیے نیا ہے۔ وہی ہے جس کے فکر کی تصویر اپنا چوکھٹا اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اس کا اسلوب اپنے فکر شعری کی تخلیق ہے۔ قدرتی ہے۔ محض نئی ہیئت یا چوکھٹا کوئی چیز نہیں۔ یہ بھی ایک قلابازی ہے ایسی ہی جیسی پرانے استاد لوگ فرمایا کرتے تھے۔

مجھے خوشی ہوگی اگر مجید کی شاعری میں وہ تمام نقائص موجود ہوں جو اُس شاعر میں لازماً ہونے چاہئیں جس نے قافیہ پیمائی کی مشق نہیں کی کیونکہ وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ہندوستان کے نئے شاعر میں مغربی کتب کے مطالعہ کی محرومی کے سبب ہونی چاہئیں۔

اس دور میں نوجوان اخلاق کی پرانی قدر و قیمت سے نامطمئن ہیں۔ اور نئی تعمیر کرنے سے عاجز۔ کیونکہ سماج خود ڈانواں ڈول ہے لہٰذا مجید جو عمر کی پختگی کے بعد اپنے آپ کو شاعر پانے پر مجبور ہوا ہے۔ اس غیر مطمئن سماجی کیفیت کا سچا آئینہ بردار ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ وہ کسی بات کا جواب نہیں ہے۔ آپ اس کو سوال ہی سوال پائیں گے"

۲۹۔ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

حفیظ

تعلیمی پریس لاہور میں باہتمام خواجہ محمد عبد اللہ پرنٹر چھپوا کر دیوندر ستیارتھی نے
"جنتا" جنتا، سنت نگر لاہور سے شائع کیا

سُکھ سپنوں پر دُکھ کی چھایا سُندر من کے بول
یہ داتا کا دان سمجھ لے یا دنیا کی دین!

انبیائے

انیائے

راج کماری جھولا جھولے داسی اُسے جھُلائے
مُورکھ جانے پھل کرموں کا، مَیں جانوں انیائے
مُجھ سے نہ دیکھا جائے

مانگے بھیک نہ پائے کوئی کوئی عیش منائے
مُورکھ جانے لیکھ کی ریکھا، مَیں جانوں انیائے
مجھ سے نہ دیکھا جائے

گدّی پر دھنون یر اجے کنگلا کنشٹ اُٹھائے
مُورکھ جانے عقل کی لیلا ——— مَیں جانوں انیائے
مُجھ سے نہ دیکھا جائے

داتا! ——— تُو ہے سب کا داتا
اور منصف کہلائے
اس پر یہ شیطانی چالا ——— تجھ سے دیکھا جائے
مُجھ سے نہ دیکھا جائے

بھگوان

بیٹھا تھا آکاش پہ
تُو آنکھوں سے دُور
لیکن اپنا من تھا تیری شردھا سے بھرپُور
آنکھوں میں پرکاش تھا تیرا
من میں تھا یہ گیان
کرم کُکرم کو دیکھتا ہے میرا بھگوان

تُو مندر میں آن براجا
پہن کے ہیرے موتی
دوار دھنش کی اوٹ میں آگئی تیری جوتی
سیوک - داس - پُجاری - پروہت
پنڈت اور ودوان
دینے لگے یہ گیان
اُن کے چرنوں کو چُھونے سے ملتے ہیں بھگوان

آرتی پُوجا
رس لبلائیں
دیو داسیاں گائیں
ہری ہری ہر —— ہری ہری ہر —— جے وشنو بھگوان
تُو ہے اناتھ کا اور نربل کے پران
جے تیری بھگوان

راگ رنگ اور چھپن بھوگ کے موہ نے تُجھ کو رجھایا
رس لیلا کے پھیر میں تجھ کو لے آیا انسان
اے میرے بھگوان!

تُو مندر میں بیٹھ رہا ہے پہن کے ہیرے موتی
مَیں حیران ہُوں اس پر تُجھ کو الجھن کیوں نہیں ہوتی
توڑ پھوڑ کر دوار وجھنش سب کر دے ایک سمان
مَن مندر میں بس نہ سکے تو مت کہلا بھگوان

ایمان

مان مہنت کی ماتی رجنی
آتی تھی اٹھلاتی
چھم — چھم — چھم چھم کرتی
لہراتی — لچکاتی
لپک جھپک سے مندر جاتی
لے پوجا کے پھول

مان مہنت کی ماتی رجنی
آتی تھی اٹھلاتی

مان مہنت کی ماتی رجنی
پہنچی کرشن دوارے
آگے مت بڑھ! —— ٹھہر بالکا!
دیکھ مہنت پکارے
دُور بیٹھ کر دیکھ مُورتی واپس لے جا پھُول
نیچ جات کو مل نہیں سکتی پربھُو چرنن کی دُھول

مان مہنت کی ماتی رجنی
سہہ گئی یہ اپمان

گر گئی پُوجا کی سامگری، چُھوٹے اُس کے پران

پرکھُو!

یہ کس کا ہے ایمان؟

اُونچ نیچ کے بندھن سے کب چُھوٹے گا اِنسان؟

چوٹ

اِک روئے چلّائے تڑپے، کلپے اور کلپائے
اِک اِک سے کہے رام کہانی
دل کا درد بتائے
من کی چوٹ دکھا بے چارا سودائی کہلائے

اِک جھلّائے طیش میں آئے
بپھرے اور بَل کھائے
آنسو پی پی کر رہ جائے

جان پہ دُکھ سہہ جائے
تیرے ساتھ لڑائی ٹھانے لیکن مُنہ کی کھائے

اِک چھُپ چھُپ کر نیر بہائے
مَن کو یہ سمجھائے
چُپ چُپ جان پہ سہہ جا پگلے
ایشور کا انیائے
اپنی آن بچائے لیکن وہ پاپی بن جائے

مَیں تیری کرنی پر راضی
مُنہ سے نہ نکلے ہائے
میرے مَن کا گھاؤ پھر بھی گہرا ہوتا جائے

جگ کی آنکھیں بند کئے ہے یہ کایا کی اوٹ
میری دُونی ہو گئی چوٹ!

راجا پرجا

رتھ پر بیٹھ کے راجا نکلے

پرجا دوڑی آئے

جُھک جُھک جائے، نمو نمو کہے، جے مہاراج پکارے

گُونج اُٹھیں جے کارے

اپنا جی بہلائے، راجا دیکھ دیکھ مُسکائے

دیکھ دیکھ کر ٹھاٹھ باٹھ

اور دیکھ دیکھ کر مایا چھایا

سُکھ رس کی اک سیتل دُنیا آنکھوں میں بس جائے

تن بے کل ہو

اور من مچلے

مَیں یہ سب کچھ پاؤں

مَیں اس میں بس جاؤں

پر جب اپنے آپ کو دیکھے تن من سب جل جائے

نردھن!

سُوکھے نیر بہائے

راجا دیکھ دیکھ مُسکائے ——————

دان

کس کی اُٹھی ہے یہ ارتھی؟

کملا؟

سیٹھ لچھمن کی پڑوسن، بیوہ؟

سیٹھ، دو گھوڑوں کی بگھّی میں جو آتا ہے اِدھر؟

شہر کا سب سے بڑا دانی؟

دیالو؟

دھنوان ؟

جس نے سونے کا چڑھایا ہے کلس مندر پر ؟

جس نے گئو شالا ابھی بنوائی تھی ؟

جس کی مِل میں ابھی پرسوں ہی چلی تھی گولی ؟

جس کے دروازے پہ مِل جاتی ہے بھکشا لیکن

بھوکی مر جائے جو اِک بیوہ پڑوسن، —— مر جائے ؟

پیٹ بھرتا نہیں مزدور کا سات آنے میں ، گولی چل جائے ؟

دان دیتے ہیں دیالو !

دھنوان !

عزّتِ نفس کے ڈاکو !

شیطان !

کپڑے کی مِل کے مالک —— آٹے کی مِل کے مالک !

دُنیا کیسے مجھ کو بھائے

تن سُکھ کا اِک ساگر چاہے
جس میں خُوب نہائے
مَن کی ہے یہ چنچل آشا
جو چاہے سو پائے
دُنیا ——— چَین نگر بن جائے

تن بے چین ہے
من بے قابو
کون انہیں سمجھائے
داس گلام کی آشا کیسی؟
جنم جنم مرجائے

مَن کی بات مَیں کہہ نہیں سکتا
مَن مرضی سے رہ نہیں سکتا
کُچھ نہیں میرے بس میں
بس گھُل گئی جیون رس میں
دُنیا
کیسے مجُھ کو بھائے؟

من کی جوت

دیکھیں لوگ آکاش پہ سُورج، سُورج کا پرکاش
جیون جوت جگائے
کلی کلی میں رنگ بھرے اور سُندر پھول کھلائے
دُنیا کو مہکائے
مَیں دیکھوں تو آئے نظر وہ میلا اور بے رُوپ
جان جلائے دُھوپ

دیکھیں لوگ آکاش پہ چاند اور چاند کی جیون جوت
جو سکھ رس برسائے
مَن میں بھر دے نئی امنگیں
جی سب کا لہرائے
ہر شے ناچے گائے
مَیں دیکھوں تو آئے نظر وہ پھیکا اور اُداس
بیٹھی جائے آس
دیکھیں لوگ آکاش پہ تارے ہنستے اور مُسکاتے
جی سب کا بہلاتے
جگ مگ جگ مگ جگ مگ کرتے
اپنے پاس بُلاتے
مَیں دیکھوں تو تین کے ٹکڑے اِک دُوجے سے دُور

بکھرے ہُوئے بے نُور

اپنے من کی جوت ہے دُنیا
دُنیا کے سب کھیل
میرا من مفلس کا دیا ہے بِن بتّی بِن تیل!

تیاگ

چُپ چُپ اپنے، چُپ بیگانے، نرسنگھے خاموش
اپنی ریکھا. لیکھ کی ہانی یا کرموں کا دوش
آشاؤں کی پُھلواری میں پُھوٹی کڑوی بیل
پالے پوسے بن لہرائی الّھڑ اور انیل
پریم لتا کی سُندرتا میں جاگ اُٹھے ارمان
اپنے پرائے ساجن بن کر آتے نظر انسان

کڑوی بیل میں میٹھے پھل آنے کی جب رُت آئی
باجے گاجے گُونج اُٹھے اور بجنے لگی شہنائی
ماں موسی اور سنگ سکھیوں نے شگن شگون منائے
ڈُومنیوں نے رنگ رچایا چھیلب سوہلے گائے

شُبھ دن آیا آج سکھی ری
شُبھ دن آیا آج

چاکر بن کر آئے کھڑے ہیں
دیکھ سکھی رنوراج!

میرے لئے یہ دلکش سُوہلے بن گئے رونا راگ
شہنائی میں ڈُوب گیا جب اُس کا آپ تیاگ
جیون پگ پر پہلے ڈگ میں دیکھ کے اپنی ٹھور
پلُو تھام کر چلی باوری ہاتھ پرائے ڈور

انوکھا سپنا

دیکھا ایک انوکھا سپنا
اپنا گھر بھی گھر نہیں اپنا
گونجی اک جھنکار
ڈول گیا سنسار
پھر کچھ اندھیارا سا چھایا
دیکھ رہی تھی جلتی کایا

سہمے سہمے سائے

دُکھ کے بادل چھائے چھائے

جلتی ہوئی ارمان چتائیں

بھوکے بچّے بے بس مائیں

گھبرائی گھبرائی جوانی

چلتی پھرتی درد کہانی

جی چاہا اس گھر کو جلا دُوں

جگ میں ایسی آگ لگا دُوں

گُونجے ایک پُکار

ڈول گیا سنسار

دیکھا ایک انوکھا سپنا

اپنا گھر بھی گھر نہیں اپنا

آج اور کل

بھوکی آنکھیں کل کو دیکھیں
جھوٹی آس لگائے
آنے والی کل کب آکر آج کی بھوک مٹائے
آنے والی کل پہ بھروسہ
کب آئے، کیا لائے؟

بیتی کل؟

بیتی کل کے دیپ کی لو کب آج کی جوت جگائے

مایا چھل کے

چھایا ڈھل کے

لوٹ کے پھر نہیں آئے

آج کی بھوک ہے آج کا رونا

آج کا راگ سُہاگ

جھُوٹ کپٹ سے

لاگ لپٹ سے

آج کے دیپ جلاؤ!

آج کے منگل گاؤ!

بیتی کل کے دیپ کی لَو کب آج کی جوت جگائے
آنے والی کل پہ بھروسہ؟
کب آئے ——— کیا لائے؟

سادہ سوال

سادہ سوال

ایک —— ؟

بے کار

حقیر اور بیچارا

تنہا

وجہِ پریشانیٔ خود

ایک اور اِک ——— دو!
جمع کا اِک سادہ سوال
رونقِ بزمِ ہستی

ایک ضرب ایک؟
دو اور اِک؟ ——— تین!
کبھی چار
کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں
اور کبھی اس سے بھی زاید ——— لیکن
پھر جو گھٹتے ہیں؟
تو ہیں پانچ کے چار
اور کبھی تین کے دو!
اور پھر اک

ایک اور اِک دو کا وہی سادہ سوال

باعث ہنگامۂ دہر

ایک ضرب ایک

ہزاروں

لاکھوں

لاکھوں، کروڑوں، اربوں

پر کوئی ایک ہے لاکھوں پہ گراں

اور کتنی لاکھ؟

حقیر اور ناچیز —— تیری عظمت کے سُتون

تُو ہے اِن سب سے الگ

اور علیحدہ

یکتا

مَیں ہُوں بد دل، مایُوس
ایک، بچارا، تنہا

تجھ کو آجائے اگر جمع کا یہ سادہ سوال
تیری دُنیا بھی حسیں ہو جائے

دعوت

دیکھتا کیا ہے؟ جھجکتا کیوں ہے؟

میری چادر کے یہ میلے سے نشاں

جن میں بے رُوپ سے چہرے ہیں عیاں

جبر و مستی کے نتیجوں کو نہ دیکھ!

اپنے اِن بھائی بھتیجوں کو نہ دیکھ!

بگڑے بگڑے یہ خط و خال نہ دیکھ!

دیکھ یہ عشرت پامال نہ دیکھ!

چھوڑ یہ بحث کہ اعمال ہیں کیا؟
دُوسری دُنیا کے احوال ہیں کیا؟
درگذر اس سے جو اُنھیں ہیں سو جائے
تیرے بیٹے کی بہن بھی کھو جائے
یا بڑی ہو کے خریدے چادر
جس پہ تُو شوق سے بیٹھے آ کر
چھوڑ! بے کار ہے یہ وہم و قیاس
عیش و عشرت میں ہے کیسا وسواس
آ — یہاں بغض نہیں بَیر نہیں
اجنبی تو ہیں مگر غیر نہیں
آ — تُجھے کُچھ نہیں کہہ سکتی سماج
یہ تو ہے عام شریفوں میں رواج

کل ترا باپ یہاں آیا تھا

آ — بڑے شوق سے تُو بھی آجا!

دیکھتا کیا ہے — جھجکتا کیوں ہے؟

نام و ننگ

"برتری اپنی کیا جتاتا ہے
یہ کمائی تو تُو بھی کھاتا ہے"

"اِتنا کہنا دلیل ہے گویا
اور تُو بھی اصیل ہے گویا"

دو شریفوں کی سُن کے یہ تکرار
مَیں کھڑا رہ گیا سرِ بازار
اور حیرت میں ایسا غرق ہُوا
کالعدم ایک ایک فرق ہُوا

نازشِ اصل و رنگ کے افسوں
غیرتِ نام و ننگ کے افسوں
ہیں یہاں بھی سبھی قرینوں میں
ایک سی دھڑکنیں ہیں سینوں میں

کسبِ مجبور پر بھی یہ احساس
عزّتِ نفس اور وضع کا پاس

ایسا باطل طلسمِ رنگ ہُوا
مُنہدم قصرِ نام و ننگ ہُوا
اس طرح مٹ گئیں مری اقدار
قہقہہ بن گئے در و دیوار

خاندانی شناختیں مت پُوچھ
عزّتیں اور شرافتیں مت پُوچھ

جانور

چھن چھنا کر گرا دیوار کا آئینہ جو اِک چوٹ کے ساتھ
ٹوٹ کر آن گرا فرش پہ شیشے کا گلاس
عشق گھبرا کے پکارا کہ یہ کیا ہوتا ہے؟
جانور؟ —— کون؟
کدھر جانِ جہاں؟
حُسن بےچارا پشیمان و خجل

مُنہ چھپائے ہُوئے ہاتھوں سے

لرزتا

خاموش

کیف و سرمستی میں کیا جانیئے کس زاویے سے

اپنے ہی عکس میں دیکھے اُس نے

لُوسی اور ٹائیگر اپنے گُنّے

بے حیا جانور، اور ——— اُن کی بہیمانہ فناد

چھن چھنا کر گرا دیوار کا آئینہ جو اک چوٹ کے ساتھ

ٹوٹ کر آن گرا فرش پہ شیشے کا گلاس

اختیار

"تیرے فرمان سے انکار ——— ؟

بھلا میری مجال ؟

ایک سجدہ تو ہے کیا سجدوں میں عُمریں کٹتیں

یہ سعادت مری قسمت میں جو لکھی ہوتی"

"پھر بھی معتُوب ہُوں! ——— راضی برضا ہُوں

لیکن

تیرے انصاف پہ حرف آتا ہے

تیرے فرمان سے انکار نہ تھی میری مجال!"

"تیری حجّت ہے فقط پستئ فطرت تیری

یہ سعادت تیری قسمت میں نہ تھی

لیکن انکار سے پہلے تجھے معلوم نہ تھا

میرے انصاف کا شکوہ نہیں زیبا ظالم!

مَیں نے اعمال پہ مختار کیا تھا تجھ کو"

سُن کے چُپ ہو گیا شیطان تو اللہ کا جواب

میرے دل میں ہے مگر یہ اُلجھن

کس سے شیطان کی فطرت کی ہوئی تھی تخلیق؟

کس نے مختار کیا تھا اُسے دوراہے پر؟

تہذیب

یک بیک کھُل گئے دوزخ کے دہانے گویا
سرکا تہذیب کے چہرے سے حریری آنچل

دندناتی ہُوئی توپیں ہیں
دھما دھم گولے

آگ اور خوُن کی ہولی ہے سلامی اس کی
قصر و ایوان نچھے جاتے ہیں

سینۂ دہر کو دہلاتی ہے دلدوز دھمک
تیرہ و تار فضاؤں میں بلاؤں کا ہجُوم
موت کا رقص
محبّت کی شکست
نارسا آہوں کا اِک سیل رواں
آسماں گیر ہے شعلوں کی لپک
قہقہے میری جہالت پہ اُڑے جاتے ہیں

جھوٹے سپنے

بادِ صبا کے ہلکوروں میں تُند ہوا تبدیل ہوئی
کلیاں چٹکیں
پھول کھِلے
مُرجھائے کنول شاداب ہوئے
جھنکاریں پھر جاگ اُٹھیں
پھر نغموں نے انگڑائی لی

آئی، خزاں میں بہار آئی

بادِ صبا —— ؟ نہیں لُو کے تھپیڑے

آگ کی لپٹیں

شُعلے

چیخیں

پھُول بنے انگارے

یکسر ختم ہُوئیں چہکاریں اور نغموں کی موت ہُوئی

چھائی، تباہی پھر چھائی

پگلے من کے جھُوٹے سپنے

کون آیا؟ —— اور کون گیا؟

بہار

پتّی پتّی جُھوم رہی تھی
مست ہَوا تھی
مست فضا
مہک رہا تھا پھُولوں کی خوشبُو سے سارا باغ
باغ بہار کو دیکھ کے بھونرا
مست ہُوا، للچایا

اِس پر کردے جان نچھاور
اُس کے مَن میں آیا
شوق سے بے خُود ہو کر وہ اِک پھُول کی جانب لپکا
اِتنے میں مالی نے بڑھ کر توڑ لیا وہ پھُول
جی بھونرے کا ٹُوٹ گیا
اور ہو گئی ختم بہار ———

نیازمندی

رُوحِ گلستاں سمجھ

جانِ رنگ و بُو سمجھ

نغمۂ بہار کہہ اصلِ ہا و ہُو سمجھ

دیکھ چشمِ شوق سے

خشم کی نگاہ سے

تیرا ذوق ہے مُجھے جو بھی چاہے تُو سمجھ

میرے رُخ پہ تاب ہے
تیرے رُخ کی تاب سے
میرے دم سے ہے تری زُلف مشکبُو سمجھ

قلزمِ حیات میں
جوش تیرے ذکر سے
میرا فکر ہے تری ہستیوں کی جُو سمجھ

مَیں ہُوں تیرا رازداں
عظمتوں کا پاسباں
اپنا پاس کر، مجُھے اپنی آبرُو سمجھ

اِک نگاہِ شوق سے
دیکھ کیا نہیں ہُوں میں
نخلِ آرزو سمجھ اصلِ جستجو سمجھ

مانگ

کہکشاں مانگ رات رانی کی
ڈھل کے جس وقت راگ میں جاگے
اِک ستی کے سہاگ میں جاگے
سوتے ارمان جگمگا اُٹھیں
رس بھرے گیت چہچہا اُٹھیں
ساز بجنے لگیں ستاروں میں
رقص جاگ اُٹھے جوئباروں میں

لطف وقفِ شباب ہو جائے
سرخوشی کامیاب ہو جائے
لیں جو کروٹ بہوگ کی باتیں
کپکپکا اُٹھیں چاندنی راتیں
تیرگی لے جنم ستاروں میں
آگ لگ جائے جوئباروں میں
زندگی اضطراب ہو جائے
جان وقفِ عذاب ہو جائے
ہو کے پیدا مری مری چاہیں
دیکھتی ہیں دبی دبی آہیں
کائنات، اپنی ذات کا پرتَو
جھلملاتے ہُوئے دِیے کی لَو
مانگ جلتی ہُوئی جوانی کی

موت

مَیں نے بچپن میں تجھے دیکھا ہے اے ربِّ کریم!
خالقِ ارض و سما اور عرشِ اعظم کا مقیم
میرے فکر و فہم سے دُور اور شہ رگ سے قریب
حاضر و ناظر ہے تُو، تیری رضا میرا نصیب
تُو خفا ہو گا، مجھے مارے گا، ڈر ڈر کے سدا
میں رہا ہوں دُور دُور

مَیں نے دیکھا ہے جوانی میں تجھے میرے خُدا
صاحبِ الفردوس اور دشمنِ شراب و شعر کا
زندگی جن کے سہارے جھُومتی گاتی رہی
مُضطرب دل کی تمنّا رقص فرماتی رہی
ڈال دے گا تُو مجھے دوزخ میں، لیکن روزِ حشر
مَیں رہا ہوں دُور دُور

مَیں نے دیکھا ہے بڑھاپے میں تجھے اے مہرباں
بے سہاروں کا سہارا، بے امانوں کی اماں
ہر گنہگارِ ازل کو وا تری آغوش ہے
خطرۂ دوزخ بدل، لاتقنطوا در گوش ہے
ہاں مگر، جب موت کو دیکھا ہے اپنے سامنے
مَیں رہا ہُوں دُور دُور

انصاف

مَیں نے مقتُول کو کیوں قتل کیا؟ —— چھوڑ اسے!
دیکھنا یہ ہے کہ یہ تیری مشیّت میں نہ تھا

مَیں نے اب تیری مشیّت کی جو کی ہے تعمیل
میرے انعام کو پاداش میں کر کے تبدیل
تیرے انصاف نے کیا خُوب دیا مجھ کو صلہ

پرچاوا

پرچھاوا

کنچن کایا —— چنچل چتون

مُکھ چندا شرمائے

چھب نیاری ، مدماتے نیناں ، جو دیکھے للچائے

کاہے کرے سنگار سجنی !

کیا انہونی آج ؟

مرگ نینی کیوں کاجر ڈارے ؟
کا ہے چھوڑی آن ؟
کنچن کیوں بھیا رُوپ بھکاری، کون گھٹا یہُو مان ؟
کاہے کرے سنگار سجنی !
کیا انہونی آج ؟

بُکل بھئی اکولائی سکھی مو سے پیت کا بھید چھپائے
اپنے من کی بات کہے اور اس بدھ جی پرچائے
کاہے کرے سنگار سجنی !
کیا انہونی آج ؟

باجی نہ من کی ستار

"آلی موری رادھکا! بول رہی اکھیاں
جھوٹی توری بتیاں
جھوٹا یہ ہار سنگار
مانو آتے نہ کشن کنہائی
سونی سیج پہ رات بتائی
توری جھوٹی بتیاں"

"جھوٹا گمان تورا

جھوٹا ہے دھیان

مَیں تو پیا سنگ رات سکھی سوتے رہی تھی

سکھی رات رات جاگ رہی موری اکھیاں"

"کاہے جھٹلائے سکھی موری بتیاں

توری کروٹ پہ کروٹ سے پائل کی جھن جھن بول بول موسے بتائے رہی تھی

آج باجی نہ من کی ستار

سکھی سوئی رہی توری پائل کی جھَن جھَن!

جھَن جھَن ——— جھَن، جھَن جھَن ——— جھَن جھَن جھنکار

"سکھی سر کی دُکھن!

"سکھی سر دکھن تورا جھوٹا جتن

توری بول رہی اکھیاں

جھوٹی توری بتیاں

باجی نہ من کی ستار"

بیوگ

مَن میں اُمنگیں، جی میں ترنگیں
رُوپ انُوپ جوانی
دُنیا ایک کہانی
مَن کی مینا چہکی
میری دُنیا مہکی
جھُوم جھُوم کر گھوم رہی تھی میرے مَن میں آیا

پھُول کی شوبھا ہے کس کارن؟

کیسی ہے بُو باس

جب نہیں بھونرا پاس

مٹیں اُمنگیں

بُجھیں ترنگیں

مَن سے اُٹھی ہُوک

دب کر رہ گئی کُوک

بیت گیا دن

شام ہُوئی

پھر چھا گئی کالی رات!

اندھیاری

اندھکاری

اندھیاری اندھکاری جس سے جیون کھاتے مات

میرے من میں پھر سے پھُولی آشا کی پھُلواری
جُگ جُگ یہ اندھیاری
جس نے تاروں کی جھلمل سے پہنچایا سندیس
اِن نینوں کو دیکھ رہے ہیں پی بیٹھے پردیس

نَینَن ساگر چھلکے

نَینَن ساگر چھلکے
پھر جل دیپک جھلکے
اپنے کنھیّا
من میں بسیّا
اُن میں آن براجے
پریت کی بنسی باجے

چرنوں میں اک دیوا داسی سُندر شام پکارے
بیٹھی پریم سہارے
یہ تارے بھی ٹُوٹ نہ جائیں
یہ جلؔ مندر پھُوٹ نہ جائیں
نینن ساگر چھلکے
پھر جلؔ دیپک جھلکے

جیون گیت

آنکھوں میں کاجل رے ماتھے پہ بندیا
من میں تھا مَن ہر گیت
مَیں نے دیکھیں پڑوسن کی چوڑیاں رے
مُجھے بھُول گیا میرا گیت

میرے بالم نے بنوا دیں چوڑیاں رے
بنی پہنے گی خوش ہو گی گائے گی
آئے گی جیون میں جیت

مَیں نے دیکھا پڑوسن کا بنگلہ بنا
مجُھے بھُول گیا میرا گیت

میرے بالم نے بنگلہ بھی بنوا دیا
اُس میں ٹہلوں گی گھُوموں گی گاؤں گی
جاگے گی پریت کی ریت
مَیں نے دیکھی پڑوسن کی موٹر کھڑی
مجُھے بھُول گیا میرا گیت

گئی یُونہی عمر یا بیت
مجُھے بھُولا رہا میرا گیت

آنکھوں میں کاجل رہے ماتھے پہ بِندیا
جیون کی جیت میرے جیون کا گیت

اکھیاں رنگ میں

اکھیاں ڈوبیں رنگ میں
من میں بھڑکی آگ
اک جیون پر چھا گئی دو نینوں کی لاگ
پل میں آشا جی اُٹھے
من کے دیپ جلائے
اک پل میں اندھیارا چھائے آشا ڈوبی جائے

نینوں کی اِس لاگ کو
جگ کہتا ہے پریت
اِک پل ہنسنا اِک پل رونا جینا مرنا ریت
دو پر بھی اِک رنگ ہیں
دو قالب اِک جان
دیپک رُوپی ایک ہے ایک پتنگ سمان
اپنی لاگ میں دیپ جلے
اور اپنا آپ جلائے
اپنی لگن میں جلے پتنگا آگ سے آگ بجھائے
اکھیاں ڈوبیں رنگ میں من میں بھڑکی آگ
اِک جیون پر چھا گئی دو نینوں کی لاگ

لغزش

لغزش

مَیں نے چاہا ——— تُجھے چاہا ——— چاہا

تیری آنکھوں نے جو پیمانِ وفا باندھا تھا
تیرے دل نے جو مرے دل میں جگہ پائی تھی
تیری آغوش میں دُنیا ہی سمٹ آئی تھی

چار سُو ظُلم کی گھنگھور گھٹا چھائی رہی
ناتوانوں کی صدا آئی قضا، آئی رہی

مُفلسی چاک بداماں پھری اور پھرتی رہی
دلِ پُر درد سے آہوں کا دُھواں اُٹھا کیا
پر یہ دُنیا کہ جو سفّاک ہے ناپاک بھی ہے
اِک حسیں خواب بنی تھی مرے ارمانوں کا
میری آنکھوں میں سمن زار سمٹ آئے تھے
گُلبنِ عیش کے انوار سمٹ آئے تھے
مَیں نے شُعلوں میں بھی نغموں ہی کو رقصاں دیکھا
مَیں نے چیخوں کو بھی دیپک ہی کی تانیں سمجھا
مَیں نے دیکھا کہ مہ و مہر بھی ہیں میرے غلام
منحصر میرے اشاروں پہ ہے دورِ ایّام
اِس حسیں خواب میں جب ڈوب گئے رسم و رواج
ایک ناگن تھی کہ پھنکار سے جاگ اُٹھی سماج

اور مَیں لے کے نوشتہ ترے ارمانوں کا
اپنے رُومان فزا رَس بھرے افسانوں کا
چاندنی راتوں کی سفّاک نظر سے بچ کے
تیرہ و تار سیاہی کی ردا اوڑھے ہُوئے
ٹھوکریں کھاتی ہُوئی گرتی ہُوئی چکراتی ہُوئی
اپنی ہی ذات سے ڈرتی ہُوئی گھبراتی ہُوئی
اِن حسیں خوابوں میں کھو جانے کو آپہنچی یہاں
تہِ دریا میں نظر آتے ہیں جو اب رقصاں

تیری آنکھوں نے جو پیمانِ وفا باندھا تھا
میری آنکھوں میں سمن زار سمٹ آئے تھے
گلبنِ عیش کے انوار سمٹ آئے تھے
تیری آغوش میں گر جانا ہی تھا میرا عروج

آج دریا کی حسیں لہروں میں ہے جس کی تلاش
تیرے پیماں کی حقیقت مرے ارمانوں کی لاش

کاش اس جبر کو لغزش ہی سمجھتا کوئی
مَیں نے چاہا —— تجھے چاہا —— چا

تفسیرِ حیات

دُور سے بھاگتے اور بڑھتے چلے آتے ہیں
جذبۂ شوق میں ڈُوبے ہُوئے سرسبز درخت
راحتِ رُوح کا سامان لئے
نغمۂ سازِ نظر بکھراتے
میری مُشتاق نگاہوں سے ملاتے ہُوئے نظریں اپنی
مُجھ سے مِل مِل کے بچھڑ جاتے ہیں

اور پھر دُور —— بہت دُور پہنچ کر ایسے
دیکھتے جاتے ہیں مُڑ مُڑ کے مجھے
جیسے اِک تشنگی محسُوس کئے جاتے ہیں

ریل اِس کیف و نظر سے عاری
اپنی منزل کو اُڑی جاتی ہے
اور سرسبز درخت ؟
دُھندلے سایوں میں بدلتے ہُوئے معدُوم ہُوئے جاتے ہیں
جیسے مَیں نے اُنہیں دیکھا ہی نہ ہو
یُونہی سایوں میں جھلکتے ہُوئے محبُوب جمال
صفحۂ دہر کے تابندہ نقوش
چند یادوں میں ڈھلے جاتے ہیں

یہ زمانے کا چلن —— اور سفر؟

میرے احباب مجھے دیکھ رہے ہیں گویا

مَیں بنا جاتا ہُوں تفسیرِ حیات

پابندی

وہ گاڑی آنے پہ کچھ بے قرار ہوتے ہوئے
لپک سے بڑھتے ہوئے اور سوار ہوتے ہوئے
نقاب الٹ کے پلٹ کر وہ تیراہٹ جانا
نمودِ حسن کے انداز میں سمٹ جانا
وہ تیری مدھ بھری آنکھیں وہ التفاتِ نظر
وہ چھائی چھائی ہوئی خود سپردگی یکسر

اک اجنبی سے یہ ناز و نیاز کیا معنی؟
حدیثِ ساقی و مُطرب کے ساز کیا معنی؟

تری نگاہ میں عشرت کی پیاس تھی شاید
کہ ایک ڈوبے ہُوئے دل کی یاس تھی شاید
ہُوئی تھی خونِ تمنّا سے کیا حنا بندی
کہ تن کی قید پہ من کی نہیں تھی پابندی
نہیں تو کیا یہ ہوس کی تھی کارفرمائی
کہ مُفلسی تھی یہ حاجت سمیٹ کر لائی

مری نگاہ میں موجود ہے ابھی وہ سماں
میں دیکھتا ہُوں ہر اک سمت گاڑیاں ہیں رواں
ہر ایک گاڑی میں تو یُوں لپک کے چڑھتی ہے
نقاب اُلٹ کے پلٹتی پلٹ کے بڑھتی ہے

ہر ایک سمت وہی ملتفت نگاہیں ہیں
کہ جن میں وادیٔ حسن و نظر کی راہیں ہیں

میں چاہتا ہوں کہ کھو جاؤں ان نگاہوں میں
نوید عیش و مسرت ہے تیری باہوں میں
مگر نظر مجھے آتی ہے اپنی پابندی
تری ہی من بسی آنکھوں میں اک حنابندی

اور ایک چہرہ اُبھر کے جو مُسکراتا ہے
نہ بھُولنے پہ بھی سب کچھ ہی بھُول جاتا ہے

بے بسی

مَیں نے چاہا تھا کہ تاروں کی بجھا دُوں شمعیں
نکہت و نُور کے سانچے میں جو دیکھا تھا اُسے
کون کر سکتا ہے انکارِ وجُود
مَیں نے دیکھی ہیں لچکتی ہُوئی بانہیں اُس کی
مرمریں شانوں پہ بکھری ہُوئی مشکیں زُلفیں
رَس بھرے ہونٹ

رسیلی آنکھیں

تابِ نظّارہ نہ مُوسٰی کو ہُوئی، کیوں ہوتی؟
اس کی آنکھوں میں تھے سہمے ہُوئے جذبات نہاں
کاش اُس نے مرے محبُوب کو دیکھا ہوتا
کاش مُوسٰی کا خُدا میرا رقیب
میرے محبُوب کے ہوتے بھی خدائی کرتا
ہائے یہ بے بسی اور مجبُوری
بر سرِ طُور ہیں روشن تارے
مَیں نے چاہا تھا کہ تاروں کی بُجھا دوں شمعیں

مراجعت

طائرِ زیست کے یک لخت جو بندھن ٹوٹے

خرخشے مٹ گئے دُنیا کے جھمیلے چھُوٹے

سرخوشی تختِ رواں لے آئی

اور مَیں اُڑنے لگا سُوئے فلک

آنِ واحد میں مگر ٹُوٹ گیا یہ بھی طلسم

ہو گئی راہ میں حائل دیوار

میرے محبوب عزیزوں کی فلک رس فریاد
نالہ و آہ وُہ بکا چیخ پکار

لَوٹ آیا ہُوں میں دُنیا کو دکھانے کے لئے
بھلا انسان کہیں مرتا ہے؟
جب تک اُس کو نہ کریں ختم عزیز
اپنے ارمانوں کی تکمیل پہ کر کے مجبُور
اور وہ اُن کی محبّت کے طفیل
سختیاں جھیلے سدا رنج سہے
روز گھُل گھُل کے مرے ——— مرتا رہے
طائرِ زیست کے یک لخت نہ بندھن ٹُوٹیں
خرخشے مٹ نہ سکیں اور نہ جھمیلے چھُوٹیں

تقدیر

میرے آنے ہی پہ موجود تھے پھول اور کانٹے

مونس و غمخوار مرے

میرے بھی خواہ بزرگ!

پھول بھی میں نے چنے کانٹوں سے زخمی بھی ہوا

میرے بچپن پہ مرے راہنما ہنستے رہے

سوچ ——— میری ہی طرح جن کی نہ تھی سوچ اپنی

سرسراتے ہوئے ملبوس ——— حریری نغمے

اِک حسین خواب جوانی کا فسُوں
ڈُوب کر جس میں ہوُا ختم خدائی کا جلال
میری بے راہ روی؟
دیکھنے والوں کی نظر!
سوچ —— میری ہی طرح جن کی نہ تھی سوچ اپنی
پھُول موجُود ہیں اور ان کی مہک بھی لیکن
زندگی کانٹوں میں اُلجھا ہوُا دامن ہے جسے
کھینچ سکتے ہیں نہ کانٹوں سے چھُڑا سکتے ہیں
اس پہ طرّہ ہے کہ ہر آن ہوا چلتی ہے
جُرم پھُولوں سے لپٹنا بھی ہے اور کانٹوں سے چھِد جانا بھی

میرے اِک ادنیٰ اشارے پہ یہ اُلجھاؤ سُلجھ کر رہ جائے
گر نہ بیٹھا ہو پسِ پردۂ تقدیر کوئی

تھپک

تمہاری روٹی تو ہاں سچ ہے چھن گئی تم سے
مگر نہ بھولو کہ بھوکا تھا میرا بچہ بھی
اور اتنی بات پہ تم ہو کہ روئے جاتے ہو
ذرا بھی صبر نہیں جی پہ اختیار نہیں
یہ حال ہے کہ تمہیں پل کو بھی قرار نہیں
ذرا تو صبر کرو جبر اختیار کرو

خدا کے واسطے تھوڑا تو انتظار کرو
میں پھر بھی ماں ہوں کہو تم جو لاکھ سوتیلی
تمہارے دکھ میں تو سکھ اپنا میں نہ چاہوں گی
ذرا تو صبر کرو جبر اختیار کرو
میں تم پہ واری گئی میرا اعتبار کرو
دیا ہے اس کو تو جاؤ تمہیں بھی میں دوں گی
تمہارے دکھ میں تو سکھ اپنا میں نہ چاہوں گی
وہ دیکھو غلّے سے لد کر جہاز آتے ہیں!

ملاپ

ولولے سینوں میں غلطاں
اور رگوں میں گرم خوں
جوشِ برنائی وفورِ شوق افسردہ دلی
زندگی؟ —— موہوم دوراہا
دھندلکے اور غبار
کاہشِ سود و زیاں، سعیِ مسلسل اور فراق

زندگی کی کلفتوں میں انتظارِ زندگی
کاہشِ سود و زیاں
اِک بحرِ ناپیدا کنار

حاصلِ عمرِ رواں ہے آج سونے کی جھلک
اور اِک جھنکار میں دو بچھڑی رُوحوں کا ملاپ
سامنے ہیں جب کہ آثارِ سحر

آہ! کس سے لُوں میں اپنی مفلسی کا انتقام
آہ! یہ دل سرد رُوحوں کا ملاپ

تغیّر

ایک سنگین و سیہ ہاتھ نہ جانے کب سے
گُلشنِ دہر میں تھا جبرِ مُسلسل کی نمُود
اِس کے ہونے سے بہاروں میں بھی تھا خوفِ خزاں
اِس کے ہونے سے ہر اِک شے پہ تھی لرزش طاری
کپکپاتی ہُوئی کلیاں تھیں شگوفے لرزاں
پھُول اِس دستِ ستمگر سے ہراساں ترساں

جس کو جب چاہے وہ چٹکی میں مسل دیتا تھا
روکتا کوئی نہ تھا اس کو نہ چرخِ کبود

اُس کے ہونے سے تھی معصوم جوانی مبہوت
اُس کے ہونے سے تھے بھٹکے ہوئے ارماں خاموش
اُس کے ہونے سے چہک پر بھی کھٹک تھی غالب
اُس کے ہونے سے مہک پر بھی تھا اِک خوف محیط
نقرئی قہقہے یوں ٹوٹ کے رہ جاتے تھے
جیسے آوارہ فضاؤں میں کسی کی فریاد
جیسے دم توڑتی راتوں میں سسکتی جانیں
روکتا کوئی نہ تھا اس کو نہ چرخِ کبود

مَیں نے اِس دستِ ستم کار کو دیکھا تو کہا

کاش تجھ پر تیرا اپنا ہی غضب ٹوٹ پڑے
قہر اللہ کا تجھ پر کسی ڈھب ٹوٹ پڑے
انگلیاں تیری جھڑیں اور یہ تباہی تھم جائے
تیرا تاریک لہو تیری رگوں میں جم جائے
تجھ پہ بجلی گرے ہو ختم تری تاب و تواں
گلشن دہر میں باقی نہ رہے خوف خزاں
کوئی باقی نہ رہے دہر میں بن کر تقدیر
کوئی باقی نہ رہے بخت و مقدر کا شکار
اپنے ہاتھوں میں رہے سلسلۂ بست و کشود

میری نفرت بھری آنکھوں نے جو روکا اُس کو
قہر آلود نگاہوں نے جو ٹوکا اُس کو

اس طرح اس کے ارادوں کی کماں ٹوٹ گئی
اس طرح سمٹی لپک اُس کی جھپٹ چھوٹ گئی
جیسے اِک ننھی دُلھن ساس کی دھمکی سہہ جائے
جیسے دہشت زدہ خرگوش سمٹ کر رہ جائے
اور بے معنی ہُوا مسئلۂ بُود و نبُود

جيون الجھن

جیون اُلجھن

جُھن جُھن — جُھن جُھن — جُھن جُھن — جُھن جُھن

بن گئی اپنے جیون کی دُھن!

پریت کی رانی آئی

من کی اِک اِک آشا جاگی لے لے کر انگڑائی

پریت کی رانی آئی

آشاؤں کے دیپ جلا کر

اپنی پیاری چھب دکھلا کر

اِک تھالی میں پھُول سجا کر

اوٹ میں جا مسکائی

پریت کی رانی آئی

اِتنے میں اِک من کا راجا آیا مکٹ سجائے

من مندر کے دِیپ جلائے پریت کی جوت جگائے

پریت کی رانی بولی رادھے چھم چھم کر کے آؤ

اِن پھُولوں سے مالا گوندھو! راجا کو پہناؤ

جیون جوت جگاؤ

چھم سے آگے بڑھ کر جونہی گننے لگی ہیں پھول
من مندر کے دیپ بجھے جانے کچھ ہو گئی بھول

پریت کی رانی ———
من کے راجا ———
لوٹ کے پھر نہیں آئے
اِس جیون میں کون اب آ کر من کے دیپ جلائے
جیون الجھن اب ہے یہی دُھن
جُھن جُھن جُھن جُھن جُھن جُھن!

جیون آشا

اِک اِک کر کے ڈوب گئے جب دیس گگن کے تارے

سو گئے بھاگ ہمارے

پھیل گیا چھوں اور اندھیرا ایسی گھٹائیں چھائیں

پگ بھولی، ڈگ ڈول گئے اور اوجھل ہو گئی ٹھور

جاگے چور

جیون جوت کو اندھیارے نے ایسی دی شہ مات

چھا گئی کالی رات

جگت پر چھا گئی کالی رات

آشاؤں کے اس مرگھٹ میں دیپ جگا اک نیارا

جاگا بھاگ ہمارا

یگ سوجھی۔ ڈگ سنبھل گئے پھر سامنے آگئی ٹھور

بھاگے چور

اس دیپک نے اندھیارے میں جیون جوت جگائی

آشا جیون جیون آشا سچّی ریت بنائی

اب بھی ریت چلے ——————

دیپ سے دیپ جلے ——————